منظور احسن عباسی

نظامِ معیشت اور زکوٰۃ

"اسلامی نظامِ معیشت کے لیے غور طلب مسائل" کے عنوان سے جناب ایم۔ اے حمید خاں صاحب (میجر ریٹائرڈ) کا ایک سوال نامہ "اسلامی تعلیم" کی اشاعت جنوری و فروری ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا ہے، جس میں مسئلہ زکوٰۃ کے باب میں ۴۵ سوالات کیے گئے ہیں۔

سرسری نظر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ میجر صاحب نے ان سوالات کی ترتیب میں بڑی ژرف نگاہی سے کام لیا ہے اور جابجا کتب کے حوالوں سے واضح ہے کہ دینی ذخائر معلومات سے انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے لیکن صرف ایک بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اگر اس حقیقت پر نظر رکھی جاتی تو بہت سی پیچیدگیاں پیدا نہ ہوتیں۔

وہ حقیقت یہ ہے کہ زکوٰۃ بھی صلوٰۃ و صوم اور حج کی طرح ایک عبادت ہے، اللہ کی عبادت بجالانے سے جو فوائد اس دنیا میں حاصل ہوتے ہیں وہ اس کے نتائج ہیں۔ اور وہ فوائد جو آخرت میں حاصل ہونگے وہ اصل مقاصد ہیں۔ نتیجہ اور مقصد دونوں میں فرق ہے۔ عبادتِ الٰہی کے بجالانے کا اصل مقصد نجات ہے۔ اگر یہ مقصد پیشِ نظر نہ ہو تو وہ عبادت نہیں ہے۔ مفکرینِ عہدِ حاضر کا یہ ذہنی رجحان سخت المناک ہے کہ وہ عبادت کے اصل مقصد کو نظر انداز کر کے خدا کی عبادت کے نہایت ادنیٰ مقاصد متعین فرماتے ہیں۔ اللہ کی عبادت کو کسی بھی معاشرتی، معاشی، تمدنی یا اخلاقی مقاصد کے پیشِ نظر انجام دینا انسانی فکر و نظر کی پستی کی دلیل اور گمراہ کُن ہے۔ عبادت کا نجاتِ آخرت اور اطاعتِ حق کے سوا کوئی بھی مقصد متعین کیا جائے تو وہ نہ صرف یہ کہ گمراہی ہے بلکہ بسا اوقات کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ نماز سے پابندیٔ وقت، سحر خیزی، چستی و چالاکی، نظافت اور صحت و عافیت حاصل ہوتی ہے۔ یا یہ کہ نماز سے تواضع، اتحاد و یک جہتی اور قومی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ تو بلاشبہ

درست ہے لیکن یہ تمام محاسن نماز کے نتائج ہیں۔ اگر صرف ایک مقصد کے پیشِ نظر نماز ادا کی جائے تو کفر ہے۔ نماز کا اصل مقصد فلاح و نجاتِ آخرت ہے۔ جو نماز ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ باقی یہ مقاصد نماز کے علاوہ دوسرے مقصدی ذرائع کے اختیار کرنے سے بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ مقصدیت کا یہ پست تصور ہی دراصل عبادت کی اہمیت کو باطل کر دیتا ہے۔ کیونکہ اگر نماز کا مقصد نظافت و پاکیزگی یا یک جہتی و ہم آہنگی وغیرہ ہو تو آخر اس میں اور ان وسائل کو بروئے کار لانے میں کیا فرق ہے جو غیر مسلم اقوام ان مقاصد کے لیے استعمال میں لاتی ہیں۔ افسوس ہے کہ غیر شعوری طور پر عہدِ حاضر کے اکثر مفکرین اس فریب میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ میں جناب میجر صاحب کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ انہوں نے اپنے سوالنامے کے عنوان "نظامِ معیشت کے لیے غور طلب مسائل" کے تحت جو زکوٰۃ کا تذکرہ فرمایا ہے وہ بھی غالباً لاشعوری طور پر اسی غلط فہمی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے زکوٰۃ کے باب میں جو سوال نامہ مرتب فرمایا ہے وہ اس غرض سے نہیں ہے کہ اس کی بجا آوری فلاح و نجاتِ اُخروی کے کن مدارجِ علیا کے پیشِ نظر ضروری ہے۔ بلکہ زکوٰۃ کو اس نقطۂ نظر سے دیکھا گیا ہے کہ آیا زکوٰۃ کہاں تک مادّی نظامِ معیشت کے برپا کرنے کا ذریعہ ہے اور یا کس طرح زکوٰۃ کے ذریعہ معاشی نظام کو بہتر بنایا جا سکتا ہے چنانچہ انہوں نے سوال کیا ہے کہ اگر غربت و افلاس کا علاج بھی زکوٰۃ کے پاس نہیں ہے تو پھر زکوٰۃ کے پاس کیا ہے؟

یہی سوال ایک اور صاحب نے نماز کی بابت کیا ہے کہ اگر نماز سے معاشی مساوات پیدا نہیں ہو سکتی تو وہ نماز کس کام کی ہے؟

یہی تصور ہے جو عباداتِ اسلامی میں ردوبدل کی مصلحت پر زور دیتا ہے اور میجر صاحب کے تمام سوالات کا مرکزی نکتہ بھی یہی ہے کہ اگر موجودہ شرح زکوٰۃ سے ایک مستحسن اور تقاضائے وقت کے مطابق نظامِ معیشت برپا نہیں کیا جا سکتا تو کیوں نہ اس میں تبدیلی کر دی جائے۔

ان سوالات پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ واضح ہو گا کہ ایسی تبدیلی کے لیے قرآن، حدیث، فقہاء ائمہ اور بزرگانِ دین کے ایسے اقوال جمع کیے گئے ہیں جس میں فقراء، مساکین اور اربابِ احتیاج کی خبر گیری اور ان کے مسائل کو حل کرنے کی تاکید ہے۔ اور اس کا ایک ہی ذریعہ ان کے ذہن میں ہے کہ شرح زکوٰۃ اموال میں ضرورت کے مطابق تبدیلی کر دی جائے۔ یعنی نہ ڈھائی فیصد کی شرح مقرر ہو نہ اموالِ زکوٰۃ کی تعیین کی جائے

نہ وقتِ ادائیگی کی کوئی قید ہو۔ نہ اس کے مصارف متعین ہوں بلکہ ضرورت اور تقاضائے زمانہ کے مطابق اور موقع کی مناسبت سے شرحِ زکوٰۃ متعین کی جائے۔

میجر صاحب نے اپنے سوال نامے کی مدد سے یہ تاثر دیا ہے کہ شرحِ اموال و زکوٰۃ نہ صرف یہ کہ قرآن کے مطابق نہیں بلکہ محدثین اور ائمہ کے منشا کے خلاف بھی ہے۔ کیونکہ اس سے نظامِ معیشت حل نہیں ہوتا۔

میجر صاحب کو بھی شاید زکوٰۃ کو عبادت تسلیم کرنے سے انکار نہیں ہے لیکن اس عبادت کی حقیقت ان کے نزدیک ایسی ہے جیسے مومن کی زندگی کے تمام اعمال، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ کیا روزی کمانا عبادت نہیں ہے؟ کیا سونا، جاگنا، اٹھنا، اور بیٹھنا عبادت نہیں ہے۔ کیا حکومت کے واجبات و ٹیکس دینا عبادت نہیں ہے؟

اس کا مطلب شاید یہ ہے کہ جس طرح ایک مومن اپنی یا عوام کی صوابدید کے مطابق روزی کماتا ہے، اٹھتا بیٹھتا ہے اور وہ عبادت ہے اسی طرح زکوٰۃ کو بھی عوام کی صوابدید کے مطابق ادا کر لینا چاہیے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عمر بھر کے اعمالِ صالحہ کی بجا آوری فجر کی صرف دو رکعت نمازِ دانستہ ترک کرنے کی بازپرس و سرزنش سے بچا سکتی ہے؟ اور کیا اصلاحِ معاشرہ کے لیے تمام دنیا کا سفر کر لینا عبادتِ حج کا بدل ہو سکتا ہے؟ اور کیا خدمتِ خلق کے لیے دن بھر بھوکا رہنے سے فریضۂ صوم ادا ہو جائے گا؟ میں نہیں سمجھتا کہ اس کا جواب اثبات میں دیا جائے تو پھر آخر مومن کے اٹھنے بیٹھنے اور نماز کے ادا کرنے یا گورنمنٹ کا ٹیکس دینے اور زکوٰۃ کے نکالنے میں وہ کیا فرق کریں گے؟

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ میجر صاحب اس امر سے غافل ہوں گے کہ ایک عبادت مقصود بالذات ہے اور ایک مقصود بالغیر یعنی ایک عبادت بذاتِ خود ایک فریضہ واجب الادا ہے اور دوسری عبادت ایک اور فریضہ واجب الادا کا ذریعہ ہے۔ مثلاً ادائے نماز اور تعمیرِ مسجد دونوں ہی عبادت ہیں لیکن نماز بجائے خود مطلوب ہے۔ اور مسجد نماز کے لیے مطلوب ہے۔ اب کیا ممکن ہے کہ ان دونوں کو ایک سمجھ لیا جائے۔ یہی حال روزہ اور حج کا بھی ہے۔ کہ دونوں فریضۂ واجب الادا عبادت اور مقصود بالذات ہیں۔ ان کے لیے جو سہولتیں مہیا کی جائیں وہ بھی عبادت ہیں لیکن مقصود بالغیر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صلوٰۃ، صوم و حج و زکوٰۃ قرآنی اصطلاح میں عبادتوں کے نام ہیں اور ان کی ماہیت وہ ہے جو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ان

میں سے ہر ایک کے لیے شرائط و ارکان ہیں جو وقت، ہیئت، مقدار اور مستقل کیف و کم پر مبنی ہیں۔ ان کے نواقض اور مفسدات مفصل کتاب و سنت میں مذکور ہیں۔ دو رکعت والی نماز اگر تین رکعت یا چار رکعت پڑھی جائے یا ایک رکوع اور دو سجدوں کی بجائے دو رکوع اور ایک سجدہ کر لیا جائے تو وہ نماز نہ ہو گی۔ اسی طرح اموال و شرحِ اموالِ زکوٰۃ میں اگر تبدیلی کر دی جائے تو پھر وہ زکوٰۃ نہیں ہے۔ اس کو کچھ اور کہنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ علم نے زکوٰۃ کے علاوہ اور دوسرے مصارف فی سبیل اللہ کو صدقہ کہا ہے۔ اسی لیے شاید میجر صاحب کا کہنا ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں صدقہ اور زکوٰۃ ہم معنی الفاظ ہیں۔ لیکن یہ افسوسناک قصورِ فہم ہے۔ بات یہ ہے کہ زکوٰۃ صدقہ ہی کی ایک قسم ہے۔ لہٰذا زکوٰۃ کو بھی صدقہ کہا گیا ہے۔ بعض جگہ صدقہ سے مراد زکوٰۃ ہے بعض جگہ غیر زکوٰۃ ہے۔ اور بعض جگہ عورتوں کے مہر کو بھی صدقہ کہا گیا ہے۔ غرض صدقہ اور زکوٰۃ میں عموم و خصوص کی نسبت ہے۔ یعنی ہر زکوٰۃ صدقہ ہے۔ لیکن ہر صدقہ زکوٰۃ نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہر نماز عبادت ہے لیکن ہر عبادت نماز نہیں ہے۔ اسی غلط فہمی کی بنا پر میجر صاحب نے اِنفاق فی سبیل اللہ اور مسائلِ فے وغیرہ کو زکوٰۃ تصور کر لیا ہے۔ اور چونکہ صدقہ یا انفاق فی سبیل اللہ کی ہیئت و مقدار متعین نہیں ہے اس لیے انہوں نے شرحِ زکوٰۃ کو بھی قابلِ ردّ و بدل تصور کر لیا۔ اور یہ دلچسپ سوال متعین کیا کہ "کیا ہم فرض انفاق" زکوٰۃ اور اختیاری اِنفاق "صدقہ" دونوں کو ایک جگہ اکٹھا نہیں کر سکتے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنی ہیں کہ کیا فرض کو امرِ اختیاری (یعنی تطوع) اور امرِ اختیاری (یا تطوع) کو فرض نہیں بنایا جا سکتا۔ گویا کسی امرِ اختیاری کو فرضِ الٰہی بنا لینا انسان کے اپنے اختیار میں ہے لیکن اگر ایسا ممکن ہو کہ ہم کسی فعل کو فرض بنا سکیں تو یہ بھی ممکن ہو گا کہ کسی فرض کو امرِ اختیاری بنا سکیں اور اس طرح ایک نیا نظامِ تشریعی بنایا جا سکے جس میں خدا کے حکم کو کوئی دخل نہ ہو۔

واضح ہو کہ میجر صاحب نے اختیاری انفاق کو فرض کے ساتھ ملا دینے کی ضرورت بھی نظامِ معیشت کی اصلاح کے پیشِ نظر محسوس فرمائی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس تجویز کا سبب خاص یہ بتایا ہے کہ اختیاری انفاق پر عمل نہیں ہو رہا ہے، جس سے محروم انسانوں کی تکالیف میں اضافہ ہو رہا ہے۔ گویا وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ فرض انفاق زکوٰۃ پر پورا پورا عمل ہو رہا ہے۔ باوجود اس کے محروم انسانوں کی تکالیف میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ کاش وہ یہ بتاتے کہ مملکتِ پاکستان کے کروڑوں صاحب نصاب اصحاب و تجار و صنعت کار و

اربابِ دول میں سے کیا آج تک کسی ایک ایسے شخص سے انہیں ملنے کا اتفاق ہُوا ہو جو فریضۂ زکوٰۃ کی موجودہ شرح کے مطابق سال بہ سال زکوٰۃ ادا کرتا ہو۔

میرا جی چاہتا ہے کہ اگر اِس دورِ ابتلا کے اندر اربابِ دول میں سے کہیں کوئی ایک شخص بھی ایسا نظر آئے تو جی کھول کر عقیدت کے پھول اس پر نثار کروں۔ واقعہ یہ ہے کہ میجر صاحب کے خیال کے علی الرغم اختیاری انفاق پر تو عمل ہو رہا ہے کہ ہر شخص کچھ نہ کچھ صدقہ کرتا رہتا ہے لیکن فرض انفاق ادا کرنے والے نظر نہیں آتے جو باقاعدہ اپنے اموالِ قابلِ زکوٰۃ کا ڈھائی فیصد حصّہ خیرات میں دے دیں۔ گویا زکوٰۃ کی موجودہ شرح میں کمی کا رجحان تو موجود ہے زیادتی کا امکان نہیں ہے۔ لہٰذا شرحِ زکوٰۃ میں اضافہ کی تجویز عوام کو اس فریضہ کی ادائیگی سے بیزار کرنے کے مترادف ہے۔ میجر صاحب سے استدعا ہے کہ وہ زکوٰۃ کی ہیئت کذائی میں ردّ و بدل کی سعی لاحاصل کی بجائے لوگوں میں صدقات و مبرات سے غریبوں، خستہ حالوں اور محتاجوں کی امداد یا دوسری ملکی فلاح و بہبود کے فریضے کی ادائیگی کا احساس بیدار کریں جس کی نہ کوئی حد ہے۔ اور نہ مصارف کی تعیین نہ وقت کی پابندی۔ بلکہ صورتِ حالات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق مالکان دولت وضیاع سے جس شرح پر مناسب ہو صدقات، ٹیکس یا چونگی کا مطالبہ ہیئتِ مقتدرہ کے اختیار میں ہے اور یہ سب کچھ اگر نیک نیتی اور درست منصوبہ بندی کے مطابق ہو تو اسلام اور شریعتِ مقدسہ کے عین مطابق ہوگا لیکن زکوٰۃ کی شرح میں کسی قسم کا تصرّف یا ردّ و بدل اسلام کے قطعاً منافی ہے۔ بلکہ اس کا تصوّر بھی المناک ہے۔

عبادات اسلامیہ کے اس تصوّر کے بعد اب اگر ان سوالات پر نظر ڈالی جائے تو ظاہر ہوگا کہ یہ سوالات پیدا نہیں ہوتے۔ جب تک کہ حکمِ زکوٰۃ کو عبادت کی بجائے نظامِ معیشت کا کوئی منصوبہ نہ تصوّر کیا جائے۔

سوالات ۳، ۵ میں انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر ہے، جس کی کوئی شرح مقرر نہیں ہے۔ اور "زکوٰۃ" انفاق کی ایک قسم ہے جس کی شرح مقرر ہے۔ لہٰذا انفاق فی سبیل اللہ کا کوئی حکم زکوٰۃ میں اضافہ کی دلیل نہیں بن سکتا۔

سوال ۴ میں اموالِ فَے کی تقسیم کا ذکر ہے۔ اور اس کی بھی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

سوال نمبر ۶ میں اکتناز کی ممانعت ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی اکتناز کی اجازت نہیں ہے جیسے نماز پڑھنے کے باوجود بھی شراب پینے کی ممانعت ہے۔ اس سے شرحِ زکوٰۃ میں تبدیلی کس طرح ثابت ہوئی۔

سوال نمبر ۷ میں کہا گیا ہے کہ شرح زکوٰۃ محتاج اور مسکین کی مدد کے لیے مکتفی نہیں ہے۔

اوّل تو یہ خیال درست نہیں اور اگر زکوٰۃ مکتفی نہیں ہے تو زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے صدقات سے ان کی مدد کیجیے کہ وہ بجائے خود ایک فرض ہے۔ مقصدیت کو بہانہ بنا کر شرح زکوٰۃ بڑھانے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

سوال نمبر ۸ میں کہا گیا ہے کہ صدقہ کا لفظ زکوٰۃ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

یہ درست ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ صدقہ کی طرح زکوٰۃ کی مقدار بھی بڑھائی جاسکتی ہے صحیح نہیں۔ کیونکہ اگر شرح بڑھائی جاسکتی ہے تو گھٹائی بھی جاسکتی ہے لیکن زکوٰۃ عبادت ہے، اس ردّ و بدل کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ تفصیل اوپر کی گئی ہے۔

سوال نمبر ۱۰، ۱۱ میں کہا گیا ہے کہ اگر وقت کا تقاضا اموالِ زکوٰۃ یا شرحِ زکوٰۃ میں اضافہ کا ہو تو اضافہ کرنے سے روکنا کس وجہ سے معقول ہے؟

اگر بتقاضائے وقت اضافہ معقول ہے تو کمی کرنا بھی معقول ہے۔ اعمال، عبادات میں ایسا تصور بھی غیر معقول ہے۔

سوال نمبر ۱۲، ۱۳ میں کہا گیا ہے کہ امام یوسف نے فرمایا کہ چنگی کی حیثیت زکوٰۃ کی ہوگی۔

ممکن ہے ایسا فرمایا ہو لیکن چنگی کو زکوٰۃ کی حیثیت دی گئی ہے، زکوٰۃ نہیں بتایا گیا۔ اور حیثیت دینے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی ادائیگی بھی اس طرح فرض ہے جس طرح زکوٰۃ کی ادائیگی۔ علمائے برحق کے نزدیک ریل کے ٹکٹ کی بھی یہی حیثیت ہے۔ یہ شرح زکوٰۃ میں اضافہ کی دلیل کس طرح ہوسکتا ہے۔ اور یہ کس طرح ثابت ہوگیا کہ اموالِ زکوٰۃ منصوص نہیں ہیں۔

سوال نمبر ۱۴، ۱۵، ۱۶ میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ نے مالِ تجارت اور گھوڑوں پر زکوٰۃ عائد نہیں کی تھی، حضرت عمرؓ نے عائد کی۔

یہ سراسر غلط ہے۔ شبلی نے اگر ایسا لکھا ہے تو غلطی کی ہے۔ شاید اس کا مطلب یہ ہے کہ عہدِ نبوی میں ایسا کوئی موقع پیش نہیں آیا۔ اموالِ زکوٰۃ یا شرحِ زکوٰۃ پر نہ کبھی اضافہ کیا گیا نہ کبھی کمی کی گئی۔

سوال نمبر ۱۷ میں بتایا گیا ہے کہ مویشیوں کی زکوٰۃ کے باب میں دو روایتوں میں اختلاف ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ موقع کی مناسبت سے شرحِ زکوٰۃ متعین فرماتے تھے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اوّل تو دونوں

روایات میں اختلاف نہیں۔ ایک حکم میں دو برس کی اونٹنی کا حکم ہے، دوسری میں دو سال کے ایک مادہ بچہ شتر کا حکم ہے۔ اس کو اختلاف سمجھنا صحیح نہیں۔ تاہم اگر کسی روایت میں اختلاف ہے تو وہ اختلاف ایسا ہی ہے جیسے آمین بالجہر یا بالخفا یا قرأت فاتحہ خلف الامام کے جواز و عدم جواز کے بارے میں اختلاف ہے۔

یہاں پر یہ امر تحقیق طلب ہے کہ ان دونوں میں سے کونسی روایت درست ہے۔ یہ مدعا ہرگز نہیں ہے کہ شرح زکوٰۃ موقع کی مناسبت سے متعین کی جاسکتی ہے۔

سوال نمبر ۱۸ میں کہا گیا ہے کہ "مقررہ شرح سے کچھ زیادہ دینے کو حضورؐ نے بہتر فرمایا ہے"۔ اس سے شرح زکوٰۃ کی تصدیق ہوتی ہے، شرح زکوٰۃ میں اضافہ کا جواز نہیں نکلتا۔

سوال نمبر ۱۹ میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ نے صدقہ دینے کا حکم دیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے گھر کی ساری پونجی دے دی۔

اس کو شرح زکوٰۃ میں اضافہ کی دلیل کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔ جبکہ اس تحریک پر بعض اصحاب نے گھر کی آدھی پونجی اور بعض نے اس سے بھی کم یہاں تک کہ بعض نے سوت کی انٹی پر اکتفا کیا۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ صدقہ کا حکم دیا تھا۔ زکوٰۃ تو ہر شخص بجائے خود پہلے ہی ادا کر رہا تھا۔

سوال نمبر ۲۰ میں حضرت ابولبابہ کے اپنی ساری دولت صدقہ کرنے کے ارادہ کا ذکر ہے۔

اس واقعہ کو زکوٰۃ کی شرح سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

سوال نمبر ۲۱ میں حضرت علیؓ کا حکم مذکور ہے کہ مال کی اس قدر ادائیگی فرض ہے جو حاجت مندوں کی کفالت کر سکے۔

اس کو بھی فریضۂ زکوٰۃ میں اضافہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور نہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ زکوٰۃ کو کسی شرح کا پابند نہیں سمجھتے تھے۔ وہ خود بھی زکوٰۃ اسی شرح سے دیتے تھے۔ اور اس کے پابند تھے۔ حاجتمندوں کی کفالت ایک جداگانہ فریضہ ہے۔

سوال نمبر ۲۳ میں بتایا گیا ہے کہ ایک بار حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ وہ حالات سے واقف ہوتے تو ارباب دولت کی فاضل دولت لے کر فقراء میں بانٹ دیتے۔

ایسا اقدام بوقت ضرورت ہر حکومت کا فرض ہے۔ لیکن زکوٰۃ کی شرح میں اضافہ کا حق کسی کو نہیں ہے۔ صحابی ممدوح نے کبھی نہیں کہا کہ میں زکوٰۃ کی شرح میں اضافہ کر دیتا۔ ایسا تصور بھی ان کے حاشیۂ خیال

میں نہیں گزرا۔

سوال نمبر ۲۴ میں ابن حزم کا یہ قول منقول ہے کہ اربابِ دولت کا فرض ہے کہ وہ فقراء اور غرباء کی معاشی کے کفیل ہوں۔

ابن حزم کا قول ہو یا نہ ہو۔ بہر حال فقراء کی کفالت اربابِ دول پر فرض ہے۔ جس طرح ممکن ہو یہ فرض ادا کرنا چاہیے۔ ابن حزم نے زکوٰۃ کی شرح میں اضافہ کے لیے نہیں فرمایا۔ وہ خود اس اضافہ کو حرام تصور کرتے ہیں۔

سوال نمبر ۲۵ میں شہاب الدین رملی نے طب کے معاوضہ اور دوا کی قیمت اور معذور کے لیے ملازم حکومت کی ذمہ داری قرار دیا ہے۔

شہاب الدین رملی نے سچ فرمایا ہے۔ لیکن یہ کہاں لکھا ہے کہ انہوں نے شرح زکوٰۃ میں اضافہ کا حکم دیا۔ رہا آپ کا یہ فرمان کہ کیا ہم اس فرض انفاق یعنی زکوٰۃ کو اس سطح پر نہیں پہنچا سکتے۔ فرض انفاق کو تو آپ جس سطح پر چاہیں پہنچائیں۔ لیکن فرض زکوٰۃ کی سطح کو جو انفاق کی ایک قسم ہے نہ بڑھایا جا سکتا ہے نہ گھٹایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ایسا کرنا مزاجِ عبادت و عبودیت کے خلاف ہے۔

سوال نمبر ۲۶ میں حضور کا یہ قول منقول ہے کہ جو کسی کو بے سہارا چھوڑ جائے اس کی ذمہ داری میرے سر پہ ہو گی۔

اس کا یہ مطلب تو نکل سکتا ہے کہ یتیموں کی کفالت حکومت کی ذمہ داری ہے۔ رہا یہ سوال کہ کیا شرح زکوٰۃ کی سطح بلند کرنے کے سوا کوئی اور حل اس کا موجود نہیں ہے؟ فلاحی مملکت کا فرض ہے کہ اگر زکوٰۃ اس کے لیے کفایت نہ ہو تو ٹیکس کے ذریعہ عوام سے رقم وصول کرے۔

سوال نمبر ۲۷ میں اس مفہوم کی حدیث منقول ہے کہ جس بستی میں کوئی شخص رات بھر بھوکا رہے اللہ تعالیٰ پر اس بستی کے تحفظ کی ذمہ داری نہیں رہتی۔

ایسی صورت ہو تو حکومت اور عوام پر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی صدقات مبرات سے کام لیں۔ اس کا علاج اگر شرح زکوٰۃ میں اضافہ ہوتا تو حضور سب سے پہلے ان حالات میں شرح کے اضافہ کا حکم صادر فرماتے۔

سوال نمبر ۲۸، ۲۹ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا واقعہ مذکور ہے کہ وہ ملک کے خستہ حال افراد کی

ذمہ داری کے احساس سے تمام رات روتے رہے۔ ایک بار یہ حکم فرمایا کہ مقروض افراد کو ادائے شرح کے لیے مالی امداد دی جائے۔ پھر سوال کیا گیا ہے کہ شرحِ زکوٰۃ جو ناقابلِ ترمیم ہے کیا اسے قابلِ ترمیم قرار دیکر ان مسائل کو حل نہیں کر سکتے۔ لیکن میجر صاحب نے نہیں فرمایا کہ خود حضرت عمر بن عبدالعزیز ہی نے کوئی ایسا حکم کیوں نہ جاری فرما دیا کہ شرح زکوٰۃ جو ناقابلِ ترمیم ہے اس میں ترمیم کر دی جائے تاکہ زکوٰۃ ہی سے اس کا خاطر خواہ حل نکل آتا اور قرض خواہوں کا قرض چکا دیتے۔ لازم یہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس کا جو مداوا کیا وہی حکومت کرے۔ اگر وہ زکوٰۃ کی شرح کے پیچھے نہیں پڑے تو ہم ناحق کیوں اس عباداتِ الٰہی میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کریں۔ اور جو صحیح طریقۂ کار ہے اسے نظر انداز کر دے۔

(باقی آئندہ)

(بقیہ نقد و نظر)

صلوٰۃ و زکوٰۃ میں کوئی تفریق ممکن نہیں، تو اُن کے ذہن میں دین میں ان کی غیر معمولی اہمیت کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ دونوں چونکہ عبادات ہیں اس لیے شارح علیہ السلام نے جس انداز سے ہمیں ان کی پابندی کا حکم دیا ہے اس میں کوئی معمولی تغیّر و تبدل نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح نمازوں کے اوقات، ان کی رکعتوں اور آداب کا مستقل تعیّن کیا جا چکا ہے بالکل اسی طرح زکوٰۃ کا نصاب، اس کی شرح بھی اور اس کے خرچ کی مدات بھی حتمی طور پر شارح علیہ السلام نے طے کر دی ہیں۔ اب کوئی شخص یا گروہ ان میں معمولی تبدیلی کرنے کا بھی مجاز نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے "قرآنی ہدایت کا مقصود" کے عنوان سے ایک نہایت اہم حقیقت کی نشاندہی کی ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ قرآنی ہدایت کا مقصود تلاش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ خود قرآن سے رجوع کر کے یہ معلوم کیا جائے کہ نزول قرآن کی غرض و غایت کیا ہے اور اس ضمن میں اس نے جو دعاوی اپنے بارے میں کیے ہیں اور ان کی تکمیل کے لیے جو طریق کار بیان فرماتے ہیں وہی درحقیقت قرآنی ہدایت کا اصل مقصود ہے۔

ع۔ح۔ص